اسلام اور جمہوریت

نظریۂ خلافت: اسلامی جمہوریت کی بنیاد

اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیش نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لیے انھیں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہیے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پانے چاہییں۔

اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہونا چاہیے جو محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔

[سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں] کاننے کی بات یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت ہے کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

یہ ہے اسلام میں جمہوریت کی اصل بنیاد۔

عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

۱۔ ایسی سوسائٹی، جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہو گی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہو گی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔

۲۔ ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہ افراد کے لیے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور

اس کی شخصیت کے ارتقا میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افراد کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہییں۔ اس کے لیے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے، بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔

۳۔ ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ کی ڈکٹیٹرشپ کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمران بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفا اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لیے اس کی ذات میں مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے، اور دوسری طرف ان عام خلفا کے سامنے جنھوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق یعنی آمر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے، کیونکہ آمریت دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔

۴۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثروت سے مشروط نہیں کیا ہے، بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا ہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے (اسلامی ریاست، ص ۱۳۹ تا ۱۴۳، بحوالہ اسلام کا سیاسی نظریہ)۔

[اس طرح اسلام نے] یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔

مغربی تھیوکریسی، جمہوریت اور اسلامی جمہوریت

اسلام میں [مغربی] مذہبی حکومت (Theocracy) کا صرف ایک جز آیا ہے، اور وہ ہے خدا کی حاکمیت کا عقیدہ۔ اس کا دوسرا جز..... یعنی خدا کا ترجمان بن کر خدا کی بادشاہی کو نافذ کرنے کے لیے پادریوں کا طبقہ]... اسلام میں قطعاً نہیں ہے۔ رہا تیسرا جز ... [یعنی مذہبی پیشواؤں کے خود ساختہ احکام کو خدائی احکام کی حیثیت سے منوانا] ... تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے، اور اس کی تشریح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی قولی اور عملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو ماخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی فقیہ، امام، ولی یا عالم کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول و فعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون و چرا مان لیا

جائے۔اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں تھیوکریسی کہنا قطعاً غلط ہے۔

دوسری جانب مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت 'یعنی ڈیموکریسی کہتے ہیں' وہ بھی دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے۔

(۱) عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت جو عوام کی اکثریت 'یا ان کے منتخب کیے ہوئے نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے 'اور

(۲) ریاست کا انتظام کرنے والی حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جز کو لیتا ہے۔رہا پہلا جز 'تو وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے قانونی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کرتا ہے جس کے احکام (خواہ وہ کتاب اللہ میں ہوں یا سنت رسول اللہ میں) ریاست کے لیے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاسی حاکمیت کو "حاکمیت" کے بجائے "خلافت" (یعنی اللہ 'حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔یہ خلافت مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمایندوں کی اکثریت کے ذریعہ سے عملاً ظہور میں آئے گی۔اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں ہے (ایضاً 'ص ۴۸۰-۴۸۱)۔

مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت

[تمام عامتہ المسلمین کی نیابت] اسلامی خلافت کو قیصریت اور پاپائیت اور مغربی تصور والی مذہبی ریاست کے برعکس ایک جمہوریت بنا دیتی ہے۔اس فرق کے ساتھ کہ اہل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت سے تعبیر کرتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے 'اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ریاست کے نظام کو چلانے کے لیے ان کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے ' اور ہماری جمہوریت بھی اسی کی متقاضی ہے۔مگر فرق یہ ہے کہ ان کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے 'اور ہمارے تصور کے مطابق اسلامی خلافت 'اللہ کے قانون کی پابند ہے (اسلامی ریاست 'ص ۳۲۰)۔

مشاورت کا اصول

ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام مسلم باشندوں کا بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہونا وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی

بنیاد اجتماعی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت کے اصول پر قائم ہوتی ہے... [خلافت کا یہ اقتدار] ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیث الجماعت سونپا گیا ہے، جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے، ان کے حوالے سے کام کرے، اس وقت تک حکمراں رہے جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں (اسلامی ریاست، ص ۳۷۱)۔

اجتماعی خلافت کے مذکورہ بالا تقاضے کو قرآن ان الفاظ میں واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ اور ان کا کام آپس کے مشورے سے ہوتا ہے (الشوریٰ: ۳۸)۔ اس آیت میں اسلامی نظام زندگی کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ صرف بیان خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اپنے فحوائے کلام کے لحاظ سے حکم بھی ہے اور اسی بنا پر کسی اجتماعی کام کو مشورے کے بغیر انجام دینا ممنوع ہے۔

یہ حکم نہایت وسیع الفاظ میں ہے اور اس میں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو، یا لوگوں کے نمایندوں سے؟ نمایندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے؟ انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں؟ انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لیے جائیں جن کی نمایندہ حیثیت معلوم و معروف ہو؟ مجلس شوریٰ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لیے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے ہو سکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لیے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع ہی قرار دیا ہے۔ البتہ اصولاً اوپر کی آیت اور اس کی توضیح کرنے والی احادیث میں تین باتیں لازم کر دی گئی ہیں۔

(۱) مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ چیز ملوکیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ اس لیے کہ حکومت کے معاملات میں سب سے اہم معاملہ تو خود رئیس حکومت کا تقرر ہے۔ اگر دوسرے معاملات میں مشورہ لازم ہے تو رئیس حکومت کا زبردستی مسلط ہو جانا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ چیز ڈکٹیٹرشپ کو بھی ممنوع ٹھہراتی ہے۔ کیونکہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی استبداد کے ہیں، اور استبداد شوریٰ کی ضد ہے۔ اسی طرح دستور کو عارضی یا مستقل طور پر معطل کرنے کے اختیارات بھی اس حکم کی موجودگی میں رئیس مملکت کو نہیں دیے جا سکتے، کیونکہ تعطل کے دور میں لامحالہ وہ

استبداد سے کام کرے گا اور استبداد ممنوع ہے۔

(۲) معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہیے، خواہ وہ براہ راست شریک ہوں یا اپنے معتمد علیہ نمایندوں کے واسطے سے شریک ہوں۔

(۳) مشورہ آزادانہ اور بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہیے۔ دباؤ اور لالچ کے تحت ووٹ یا مشورہ لینا دراصل مشورہ نہ لینے کا ہم معنی ہے۔

پس دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہوں، اس میں شریعت کے یہ تینوں اصول بہرحال محفوظ رہنے چاہییں۔ اس میں ایسی کوئی گنجائش نہ رکھی جانی چاہیے کہ کسی وقت بھی عوام سے یا ان کے معتمد علیہ نمایندوں سے مشورہ لیے بغیر حکومت کی جانے لگے۔ اس میں انتخابات کا ایسا نظام تجویز کیا جانا چاہیے جس سے پوری قوم شریک مشورہ ہو سکے اور اس میں ان اسباب کا سدباب ہونا چاہیے جن کے زیر اثر عوام سے یا ان کے نمایندوں سے خوف یا لالچ یا فریب کے تحت رائے لینا ممکن ہو (ایضاً، ص ۳۷۴ تا ۳۷۵)۔

انقلاب کا راستہ: جمہوریت

ظاہر بات ہے کہ جو لوگ زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے کے قائل نہ ہوں، بلکہ آئینی اور جمہوری طریقوں کے پابند ہوں، وہ اپنے نظریے اور پروگرام کو عمل میں لانے کا صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عوام میں اپنے خیالات کی تبلیغ کریں، اور رائے عامہ کو اس بات کا قائل کریں کہ ملک کے مسائل کا جو حل وہ پیش کر رہے ہیں وہی صحیح ہے۔ لیکن یہ طریق کار اسی صورت میں بار آور ہو سکتا ہے جب کہ فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہو، اور ان کی رائے ہموار ہو جانے کے معنی یہ ہوں کہ ملک کا نظام اسی نظریے اور پروگرام پر چلے گا جسے انھوں نے پسند اور قبول کیا ہے۔ (تحریک جمہوریت، کراچی بار کونسل سے خطاب، ۱۶ مارچ ۱۹۶۸، ص ۲)۔

پاکستان اور جمہوریت

ہر آدمی کی عقل اس بات کی گواہی دے گی، اور انسانی فطرت انصاف کا جو تصور رکھتی ہے وہ خود اس بات کی شہادت دے گا کہ ایک ملک کے نظام کو چلانے کے لیے اولیں اور پہلی بنیاد اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ ملک کسی شخص کا نہیں، کسی خاندان یا گروہ کا نہیں، بلکہ اپنے سارے باشندوں کا ہے۔ ملک کے متعلق جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ سارے باشندوں کا ہے، کسی شخص یا خاندان یا گروہ کا نہیں ہے، تو پھر عقل اور انصاف دونوں اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ملک کا نظام ملک کے باشندوں کی مرضی اور ان کی رائے کے مطابق چلنا چاہیے۔ کسی شخص کا یہ فرض کر لینا کہ ملک کے

کروڑوں باشندے بے عقل اور نااہل ہیں' اور صرف وہی اکیلا ایسا ہے جو عقل اور اہلیت لے کر آیا ہے' یا تو محض بے عقلی ہے یا پھر بدنیتی کے ساتھ ہی ایسی لغو بات زبان سے نکالی جا سکتی ہے۔ کوئی نیک نیت مرد عاقل اس طرح کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ معقولیت اور انصاف یہ ہے کہ اس بات کو سیدھی طرح سے مان لیا جائے کہ ملک جن باشندوں کا ہے ان ہی کی رائے اور مرضی کے مطابق اس کا نظام چلنا چاہیے۔

عقل اور انصاف دونوں کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے تمام حصہ داروں کو اس کے معاملات میں بولنے کا آزادانہ حق ہونا چاہیے۔ اگر ان کو بولنے کا آزادانہ حق نہیں ہے تو ان کا یہ حق تسلیم کرنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ وہ معاملات چلانے کی ذمہ داری میں شریک ہیں۔

اس کے ساتھ عقل یہ بھی کہتی ہے اور یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے کہ ملک کے باشندوں کی اکثریت جس طرح کا نظام چاہے' ویسا ہی نظام ملک میں چلنا چاہیے۔ قلیل التعداد لوگ جو اکثریت کے نظریات سے متفق نہ ہوں' انھیں صبر کے ساتھ اس بات کو برداشت کرنا چاہیے کہ اکثریت کے نظریے پر ملک کا نظام چلے' اور ملک کے اندر ایسے حالات موجود رہنے چاہییں کہ ہر نقطہ نظر رکھنے والا آدمی عوام کے سامنے اپنے نظریات پیش کر سکے اور یہ امید رکھ سکے کہ جس وقت بھی اکثریت اس کی ہم خیال ہو جائے گی ملک کا نظام اس کے نظریات کے مطابق تبدیل ہو جائے گا۔ زبردستی کسی کو اپنے نظریات لوگوں پر ٹھونسنے کا حق نہ ہو۔ سازشیں اور ریشہ دوانیاں کر کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے دروازے کسی کے لیے کھلے نہ ہوں۔ مگر اظہار خیال کی آزادی ہر ایک کو ہونی چاہیے۔ عوام کی رائے اپنے نظریے کے حق میں ہموار کرنے کے مواقع سب کے لیے کھلے رہنے چاہییں اور ملک کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ عوام کی اکثریت جس نظریے یا جس پروگرام سے متفق ہو جائے' کسی رکاوٹ کے بغیر بالکل پرامن طریقے سے اقتدار اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ کسی اقلیت کو خواہ وہ کیسی ہی باا ثر ہو' یہ حق نہ ہونا چاہیے کہ وہ اڑ کر بیٹھ جائے اور کہے کہ ہم اس نظریے کو نہ چلنے دیں گے (بحوالہ جمہوریت' جلسہ عام' راولپنڈی' ۱۱ مئی ۱۹۶۸' ص ۴۵ تا ۵۱)۔

میں صاف صاف کہتا ہوں کہ جب تک اس ملک میں جمہوری نظام بالکل صحیح فطری اور معقول اصولوں پر قائم نہیں ہوتا' اس وقت تک اس ملک کی خیر نہیں ہے۔ اگر ہم یہ غلطی نہیں کرنا چاہتے کہ ڈیڑھ دو سو برس کی غلامی کے بعد جو آزاد مملکت خدا نے ہمیں بخشی ہے اسے اپنے ہاتھوں برباد کر کے پھر کسی عذاب کو اپنے اوپر دعوت دیں' تو ہمیں سیدھی طرح یہ اصول مان لینے چاہییں کہ:

۱۔ ملک باشندوں کا ہے' کسی شخص یا گروہ یا برادری کا نہیں ہے' اس لیے اس کا نظام باشندوں کی مرضی سے ہی بننا اور چلنا چاہیے۔

○ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جن کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمایندہ منتخب کریں۔

○ انتخاب وہی صحیح ہے جس میں ملک کے ہر بالغ شخص کو براہ راست رائے دہی کا حق ہو۔ بالواسطہ انتخاب جمہوریت نہیں بلکہ آمریت چلانے کا آلہ ہوتا ہے۔

○ جس انتخاب میں دھن' دھونس' دھاندلی اور انتظامی افسروں کی مداخلت سے کام لیا جائے وہ سرے سے کوئی انتخاب ہی نہیں ہے اور قوم کو ایسے انتخاب میں رائے دہی کا حق حاصل ہونا یا نہ ہونا بالکل یکساں ہے۔

○ ملازمین حکومت خواہ' وہ فوجی ہوں یا سول' ان کا کام خود حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ عوام کے نمایندوں کے تحت حکومت کا انتظام کرنا ہے۔

○ ملک کے نمایندوں کی جو پارلیمنٹ یا اسمبلی بھی ہو' تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں ہونے چاہییں 'کوئی شخص بھی اس پر جج بنا کر نہ بٹھایا جانا چاہیے۔

○ ملک کے نظام کا صحیح طریقے سے چلنا اس پر منحصر ہے کہ ملک میں پریس آزاد ہو' پلیٹ فارم آزاد ہو' خبررسانی اور نشرو اشاعت کے ذرائع پر کسی طرح کا بے جا کنٹرول نہ ہو' لوگ اپنے ملک کے حالات سے ٹھیک ٹھیک باخبر رکھے جائیں' اور انھیں ہر نقطہ نظر سننے اور آزادی کے ساتھ بحث مباحثہ کر کے رائے قائم کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں۔

○ ملک کا نظام اس نظریے پر قائم ہونا چاہیے جسے ملک کے باشندوں کی اکثریت قبول کرتی ہو' مگر جن نظریات کے لوگوں کی اقلیت ہو انھیں اس امر کے پورے مواقع حاصل رہنے چاہییں کہ وہ رائے عام کی تائید حاصل کر کے برسراقتدار آسکیں' اور کبھی ایسے حالات پیدا نہ ہونے چاہییں کہ کسی خیال کے لوگ تبدیلی نظام کے لیے غیر آئینی راستے تلاش کرنے لگیں۔

[پہلی بنیاد جس] پر زیادہ سے زیادہ اتفاق کے ساتھ پاکستان کا نظام زندگی تعمیر کرنا ممکن ہے' وہ یہ ہے کہ قرآن و سنت کو منبع ہدایت اور اولین ماخذ قانون تسلیم کیا جائے۔ دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہو سکتا ہے "جمہوریت" ہے۔ یہ خود قرآن و سنت کا منشا بھی ہے' اور باشندگان ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔ اس کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ ملک کسی خاص شخص' یا طبقے اور گروہ کا نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کا ہے جو اس میں رہتے ہیں' لہٰذا اس کا انتظام ان سب کی' یا کم از کم ان کی اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے' اور ان کو اصولاً یہ حق اور عملاً یہ موقع حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے حکمراں اپنی آزاد مرضی سے چنیں اور اپنی آزاد مرضی ہی سے ان کو تبدیل کر سکیں۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی بہت سی شکلیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں اور بہت سی نئی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں۔ بحث اس کی کسی

خاص شکل میں نہیں بلکہ اس امر میں ہے کہ جو شکل بھی اختیار کی جاتی ہے اس میں جمہوریت کی یہ حقیقت فی الواقع موجود ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر یہاں کوئی ایسا نظام قائم کر دیا جائے جس میں باشندگان ملک کی نہیں بلکہ کسی خاص طبقے کی مرضی کو غلبہ حاصل ہو تو خواہ اس پر کتنے ہی جلی حروف میں "جمہوریت" کا سرعنوان لکھ دیا جائے، اس پر عام لوگوں کا مطمئن ہونا اور مطمئن رہنا بہرحال ممکن نہیں ہے، اور نہ یہ ممکن ہے کہ اسے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے سب یا اکثر باشندوں کا دلی تعاون حاصل ہو سکے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جمہوریت میں بھی بہت سے نقائص ہوتے ہیں، اور وہ نقائص بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں جبکہ کسی ملک کی آبادی میں شعور کی کمی ہو، ذہنی انتشار موجود ہو، اخلاق کمزور ہوں، اور ایسے عناصر کا زور ہو جو ملک کے مجموعی مفاد کی بہ نسبت اپنے ذاتی، نسلی، صوبائی اور گروہی مفاد کو عزیز تر رکھتے ہوں۔ لیکن ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم تر حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کرنے اور اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان اسی وقت اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اسے اپنے اختیار سے کام کرنے اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھالنے کا موقع حاصل ہو۔ آغاز میں اس کے اندر بہت سی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر تجربات کی درس گاہ بالآخر اسے سب کچھ سکھا دیتی ہے اور ٹھوکریں کھا کھا کر ہی وہ کامیابی کی راہ پر آگے بڑھنے کے قابل بنتا ہے۔ ورنہ اگر وہ کسی سرپرست کے سہارے جیتا رہے تو ہمیشہ نابالغ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ وہ بھی کبھی نابالغی کی حالت سے نہیں نکل سکتی جب تک کہ اس امر واقعی سے اس کو سابقہ پیش نہ آجائے کہ اب اپنے بھلے برے کی وہ خود ذمہ دار ہے، اس کے معاملات کا اچھی طرح یا بری طرح چلنا اس کے اپنے ہی فیصلے پر منحصر ہے۔ آغاز میں وہ ضرور غلطیاں کرے گی اور ان کا نقصان بھی اٹھائے گی، لیکن صحیح طریقے پر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کا کوئی راستہ ان تجربات کے سوا نہیں ہے۔ علاوہ بریں جمہوری نظام ہی وہ ایک نظام ہے جو ایک ایک شخص میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ ملک اس کا ہے، ملک کی بھلائی اور برائی اس کی اپنی بھلائی اور برائی ہے، اور اس بھلائی اور برائی کے رونما ہونے میں ذاتی طور پر اس کے اپنے فیصلے کی صحت یا غلطی کا بھی دخل ہے۔ یہی چیز افراد میں اجتماعی شعور بیدار کرتی ہے۔ اسی سے فرداً فرداً لوگوں کے اندر اپنے ملک کے معاملات سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی کی بدولت بالآخر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ملک کی بھلائی کے لیے کام کرنے اور ملک کو داخلی و خارجی مضرات سے بچانے میں پورے ملک کی آبادی اپنی پوری طاقت استعمال کرنے لگے۔ دوسرا جو نظام بھی ہو، خواہ وہ بادشاہی ہو یا ڈکٹیٹرشپ یا اشرافیت، اس میں عوام الناس حالات کے محض "تماشائی" بن کر رہتے ہیں اور جب ان حالات کے ردوبدل یا بناؤ اور بگاڑ میں ان کی رائے اور

مرضی کا دخل نہیں ہوتا تو وہ ان میں دلچسپی بھی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ جمہوریت کے جو اور جیسے بھی نقائص ہوں' انھیں اس نقصان عظیم سے بہرحال کوئی نسبت نہیں ہے۔

پچھلے چند سال میں ہمارے ہاں جو حالات پیش آئے ہیں انھیں اس بات کی دلیل ٹھیرایا جاتا ہے کہ یہاں جمہوریت ناکام ہو چکی ہے' اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے اس کے اہل نہیں ہیں۔ اس کی مختلف قسم کی متبادل صورتیں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ یہاں جمہوریت تو ضرور ہونی چاہیے مگر اسے قابو میں رکھنے والی ایک بالاتر طاقت بھی ضروری ہے جو اس کو بگڑتے دیکھ کر درست کر دیا کرے۔ اور کوئی یہ پردہ بھی باقی نہیں رہنے دیتا' اور صاف کہتا ہے کہ ایک بگڑی ہوئی جمہوریت سے ایک خیراندیش اور مستعد آمریت بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن اگر ٹھنڈے دل سے ان تمام حالات پر غور کیا جائے جو اب تک یہاں پیش آئے ہیں تو کسی صاحب بصیرت کے لیے یہ بات سمجھنی مشکل نہ ہوگی کہ یہاں جو چیز ناکام ثابت ہوئی ہے وہ جمہوریت تھی ہی نہیں۔ جمہوریت تو نام ہی اس چیز کا ہے کہ عام لوگ خود اپنے قومی و ملکی معاملات کو چلانے کے ذمہ دار ہوں اور وہ تجربے سے سبق سیکھ سیکھ کر اپنی غلطیوں کی خود تلافی کرتے چلے جائیں۔ یعنی ایک یا چند مرتبہ اگر ان کا انتخاب غلط ثابت ہو اور اس کے نقصانات ان کے سامنے آجائیں تو کوئی دوسرا مداخلت کر کے اس کی اصلاح کرنے نہ آئے بلکہ وہ خود ہی ایک معروف و مسلم ضابطے کے مطابق اس کی اصلاح کرتے رہیں۔ یہ چیز یہاں کس روز قائم ہوئی تھی کہ اب اس کی ناکامی کا دعویٰ کیا جاتا ہے؟ یہاں تو جو چیز قائم ہوئی تھی وہ جمہوریت اور آمریت کی ایک ایسی آمیزش تھی جس کے اندر ان دونوں میں سے کسی ایک نظام کا حق بھی ادا نہیں ہو رہا تھا۔ اب اگر اس کے برے نتائج سامنے آگئے ہیں تو اسے جمہوریت کی ناکامی قرار دینا غلط ہے' اور اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ اسے کسی نقاب پوش یا بے نقاب آمریت کے حق میں دلیل ٹھیرایا جائے۔

یہ تو ہے استدلال کی غلطی۔ اب رہیں وہ متبادل صورتیں جو جمہوری نظام کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہیں' تو ان کے بارے میں یہ بات ہم کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جمہوریت کو درہم برہم کر کے آمریت کی راہ پر چل پڑنا جتنا آسان ہے' جمہوریت کی طرف پھر پلٹ آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ آمریت خواہ پرامن طریقے ہی سے قائم ہو' بہرحال پرامن طریقے سے دفع نہیں ہو سکتی۔ اور اس امر کی بھی کوئی ضمانت کسی کے پاس نہیں ہے کہ جو لوگ ابتداً آمریت کے سربراہ کار ہوں وہی ہمیشہ اس کے سربراہ کار رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل بساط الٹ جائے اور آمر خود مامور ہو کر رہ جائیں' بلکہ آمریت کے شکار ہو کر رہیں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو --- جمہوریت کی نمائندگی کرنے والوں کو بھی اور آمریت کی طرف رجحان رکھنے والوں کو بھی --- اس طرح کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ آیا وہ آمریت کے ان نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جو بہرحال اس کے

فطری نتائج ہیں؟ آمریت خواہ کتنی ہی خیراندیش ہو اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ قائم کی جائے 'اس کا مزاج اس کے اندر لازماً چند خصوصیات پیدا کر دیتا ہے جو اس سے کبھی دور نہیں ہو سکتیں 'اور ان خصوصیات کے چند لازمی اثرات ہوتے ہیں جو مترتب ہوئے بغیر نہیں رہتے۔وہ تنقید کو برداشت نہیں کرتی۔وہ خوشامد پسند ہوتی ہے۔وہ اپنے محاسن کا اشتہار دیتی اور عیوب پر پردہ ڈالتی ہے۔اس میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ خرابیاں بروقت نمایاں ہو جائیں اور ان کا تدارک کیا جاسکے۔وہ عام رائے اور افکار و نظریات سے غیر متاثر ہوتی ہے۔اس میں ردوبدل کسی کھلے کھلے طریقے سے نہیں بلکہ درباری سازشوں اور جوڑ توڑ سے ہوتا ہے جنھیں عوام الناس صرف تماشائی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے رہتے ہیں۔اس میں صرف ایک محدود طبقہ ملک کے سارے دروبست پر متصرف ہوتا ہے اور باقی سب بے بس محکوم بن کر رہتے ہیں۔اس کے تحت یہ ممکن ہی نہیں ہوتا کہ پوری قومی طاقت 'دلی رضا اور ارادے کے ساتھ کسی مقصد کے لیے حرکت میں آسکے۔اس کا آغاز چاہے کتنی ہی نفع رسانی کے ساتھ ہو 'انجام کار وہ ایک جابر طاقت بنے بغیر نہیں رہتی،اور عام لوگ بیزار ہو کر اس سے خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگتے ہیں۔مگر خلاصی کے جتنے پرامن راستے ہوتے ہیں وہ انھیں چن چن کر بند کر دیتی ہے اور مجبوراً ملک ایسے انقلاب کی راہ پر چل پڑتا ہے جو مشکل ہی سے اس کو کسی منزل خیر پر پہنچنے دیتے ہیں۔

ان نتائج پر جو شخص بھی بے غرضی کے ساتھ غور کرے گا وہ کبھی کسی نوع کی آمریت کو جمہوریت پر ترجیح نہ دے گا خواہ آمریت کا وہ مقام خود اسی کو کیوں نہ حاصل رہا ہو (ترجمان القرآن 'جلد ۴۴ ' عدد ۶)۔

اسلام اور جمہوریت

جمہوریت کے [موجودہ نظام کے] بارے میں جو تنقید کی [جارہی] ہے اس کے تمام نکات اپنی جگہ درست ہیں،لیکن اس مسئلے میں آخری رائے قائم کرنے سے پہلے چند اور نکات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔

اولین سوال یہ ہے کہ انسانی معاملات کو چلانے کے لیے اصولاً کون سا طریقہ صحیح ہے؟ آیا یہ کہ وہ معاملات جن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں ان کی مرضی سے سربراہ کار مقرر کیے جائیں 'اور وہ ان کے مشورے اور رضامندی سے معاملات چلائیں اور جب تک ان کا اعتماد سربراہ کاروں کو رہے اسی وقت تک وہ سربراہ کار رہیں؟ یا یہ کوئی شخص خود سربراہ کار بن بیٹھے اور اپنی مرضی سے معاملات چلائے اور اس کے تقرر اور علیحدگی اور کارپردازی میں سے کسی چیز میں بھی ان لوگوں کی مرضی و رائے کا کوئی دخل نہ ہو جن کے معاملات وہ چلا رہا ہو؟

اگر ان میں سے پہلی صورت ہی صحیح اور مبنی بر انصاف ہے 'تو ہمارے لیے دوسری صورت کی

طرف جانے کا راستہ پہلے ہی قدم پر بند ہو جانا چاہیے' اور ساری بحث اس پر ہونی چاہیے کہ پہلی صورت کو عمل میں لانے کا زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ کیا ہے۔

دوسری بات جو نگاہ میں رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ جمہوریت کے اصول کو عمل میں لانے کی جو بے شمار شکلیں مختلف زمانوں میں اختیار کی گئی ہیں یا تجویز کی گئی ہیں' ان کی تفصیلات سے قطع نظر کر کے' اگر انھیں صرف اس لحاظ سے جانچا اور پرکھا جائے کہ جمہوریت کے اصول اور مقصد کو پورا کرنے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں' تو کوتاہی کے بنیادی اسباب صرف تین ہی پائے جاتے ہیں۔

اول یہ کہ "جمہور" کو مختارِ مطلق اور حاکمِ مطلق فرض کر لیا گیا اور اس بنا پر جمہوریت کو مطلق العنان بنانے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ جب بجائے خود انسان ہی اس کائنات میں مختار مطلق نہیں ہے تو انسانوں پر مشتمل کوئی جمہور کیسے حاکمیت کا اہل ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر مطلق العنان جمہوریت قائم کرنے کی کوشش آخر کار جس چیز پر ختم ہوتی رہی ہے وہ جمہور پر چند آدمیوں کی عملی حاکمیت ہے۔ اسلام پہلے ہی قدم پر اس کا صحیح علاج کر دیتا ہے۔ وہ جمہوریت کو ایک ایسے بنیادی قانون کا پابند بناتا ہے جو کائنات کے اصل حاکم نے مقرر کیا ہے۔ اس قانون کی پابندی جمہور اور ان کے سربراہ کاروں کو لازماً کرنی پڑتی ہے اور اس بنا پر وہ مطلق العنانی سرے سے پیدا ہی نہیں ہونے پاتی جو بالآخر جمہوریت کی ناکامی کا اصل سبب بنتی ہے۔

دوم یہ کہ کوئی جمہوریت اس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک عوام میں اس کا بوجھ سہارنے کے لائق شعور اور مناسب اخلاق نہ ہوں۔ اسلام اسی لیے عام مسلمانوں کی فرداً فرداً تعلیم اور اخلاقی تربیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایک فرد مسلمان میں ایمان اور احساس ذمہ داری اور اسلام کے بنیادی احکام کا اور ان کی پابندی کا ارادہ پیدا ہو۔ یہ چیز جتنی کم ہو گی جمہوریت کی کامیابی کے امکانات کم ہوں گے اور جتنی زیادہ ہو گی امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

سوم یہ کہ جمہوریت کے کامیابی کے ساتھ چلنے کا انحصار ایک بیدار اور مضبوط رائے عام پر ہے۔ اس طرح کی رائے عام اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب معاشرہ اچھے افراد پر مشتمل ہو' ان افراد کو صالح بنیادوں پر ایک اجتماعی نظام میں منسلک کیا گیا ہو' اور اس اجتماعی نظام میں اتنی طاقت موجود ہو کہ برائی اور برے لوگ اس میں نہ پھل پھول سکیں' اور نیکی اور نیک لوگ ہی اس میں ابھر سکیں۔ اسلام نے اس کے لیے بھی ہم کو تمام ضروری ہدایات دے دی ہیں۔

اگر مندرجہ بالا تینوں اسباب فراہم ہو جائیں تو جمہوریت پر عمل درآمد کی مشینری خواہ کسی طرح کی بنائی جائے' وہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے۔ اور اس مشینری میں کسی جگہ کوئی قباحت محسوس ہو تو اس کی اصلاح کر کے بہتر مشینری بھی بنائی جا سکتی ہے۔ (مرتبہ: خ-م)